خالد سہیل

فہمیدہ ریاض سے انٹرویو

خالد سہیل: فہمیدہ ریاض صاحبہ، ہر معاشرے اور ہر عہد میں جب کوئی شاعر، ادیب یا فنکار احتجاج کی آواز بلند کرتا ہے تو اسے اس کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ آپ نے بھی اپنے ماحول کے سیاسی جبر اور معاشی اور سماجی ناانصافی کے خلاف آواز اٹھائی تھی، آپ کو اس کی کیا قیمت ادا کرنی پڑی؟

فہمیدہ ریاض: دیکھیے بہت ہی heavy price pay کرنی پڑتی ہے۔ جب کچلے ہوے طبقات کے لوگ کچھ کہنا شروع کرتے ہیں تو سب سے پہلے ان کا اپنا طبقہ ان سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔ آپ کے سامنے سیاہ فام لکھنے والوں کی مثالیں موجود ہیں۔ ان کے ادیبوں نے جب کچھ کہنا شروع کیا تو ان کی اپنی کمیونٹی کے لوگوں نے بھی انھیں رد کر دیا۔ They stood out as a sour thumb in their own community. ان ادیبوں کی کمیونٹی ایک لمبے عرصے تک خود کو ان کے ساتھ identify کرنا چھوڑ دیتی ہے۔ اگر identify کرتی بھی ہے تو اس وقت جب وہ خون تھوک چکے ہوتے ہیں۔

عورتیں بھی میرے خیال میں کچلے ہوئے طبقات میں سے ہیں۔ ان میں سے جو لکھتی ہیں چونکہ وہ باقی عورتوں کی طرح نہیں ہوتیں، اس لیے عورتوں کی کمیونٹی خود انھیں اپنا نمائندہ نہیں سمجھتی بلکہ ایک عجیب سی چیز سمجھنا شروع کر دیتی ہے۔ اس میں ان عورتوں کا بھی قصور نہیں کیوں‌کہ ان کے لیے یہ ایک نیا phenomenon ہوتا ہے۔ اس لیے وہ confuse سی ہوتی ہیں۔

جب میری پہلی کتاب ''پتھر کی زبان'' چھپی جس میں کالج کے زمانے کی رومانوی قسم کی نظمیں تھیں اور اس روایت سے زیادہ مختلف بھی نہیں تھیں جو چلتی چلی آئی ہے، تو اس کو بہت پسند کیا گیا۔ وہ تو میری خوش قسمتی تھی کیونکہ جب کسی ادیب کی تخلیقات کو پسند کیا جائے تو اس سے خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے۔ اس دور میں مجھ پر چاروں اطراف سے داد و تحسین کے ڈونگرے برس رہے تھے۔

اصل مسئلہ ''بدن دریدہ'' سے شروع ہوا۔ اس میں وہ باتیں کہی گئیں‌تھیں جو اس

وقت تک نہیں کہی گئی تھیں۔ اس کے بعد ایک confusing سا سلسلہ شروع ہوا۔ اس کی قیمت بہت مہنگی تھی۔ پہلے یہ سمجھا جاتا ہے کہ اگر عورت ایسے الفاظ لکھ رہی ہے ــ فی الوقت میں ''الفاظ'' کی بات کر رہی ہوں، ''خیال'' تو بعد کی بات ہے ــ جیسے ''پستان'' کا لفظ، تو سمجھا جاتا ہے کہ یہ تو بہت بیہودہ عورت ہے۔ عورتیں بھی یہی سمجھ رہی ہوتی ہیں، مرد بھی یہی سمجھ رہے ہوتے ہیں۔ اس ردِ عمل سے عورت بہت پریشان ہو جاتی ہے۔ اگر وہ بالائی طبقے سے تعلق رکھتی ہو تب بھی ٹھیک ہے کیونکہ اس طبقے کی عورتیں کرتی کراتی تو کچھ ہیں نہیں، نوکر چاکر ہوتے ہیں، کھانا مل رہا ہوتا ہے۔ لیکن وہ عورتیں جو محنت کش طبقے سے تعلق رکھنا چاہتی ہیں، اپنی روٹی روزی کمانا چاہتی ہیں، چاروں طرف ایسا ماحول ہو تو کتنا تکلیف دہ ہوگا۔ میں اتنے شدید ڈپریشن کا شکار ہو گئی تھی کہ میں نے شہر میں نوکری چھوڑ دی تھی اور شہر سے باہر ایک فیکٹری میں نوکری کر لی تھی جہاں مجھے کوئی نہ جانتا تھا۔ کسی کو پتہ نہ تھا کہ یہ فہمیدہ ریاض ہے جس نے ''بدن دریدہ'' لکھی ہے۔ یہ قیمت ایک عورت کو ادا کرنی پڑتی ہے۔

خ۔ س۔: اس ماحول میں کیا ایسے لوگ یا گروہ بھی تھے جنھوں نے آپ کو support کیا؟

ف۔ ر۔: میں نے اس زمانے میں ایسے گروہ تلاش کیے جو مجھے support کریں۔ میں ۱۹۷۳ میں لندن سے واپس پاکستان گئی۔ وہ بیج جو کالج کے زمانے میں ہمارے ذہنوں میں بویا گیا تھا، جس میں ہم نے ایوب خان کے خلاف آواز اٹھائی تھی اور جمہوریت کی کوششیں کی تھیں۔ جب وہ کوششیں بارآور ہوئیں، الیکشن ہوے اور جمہوریت آئی۔ ان دنوں تیسری دنیا میں سوشلزم کی تحریک پروان چڑھ رہی تھی اور ہم پُر امید تھے کہ انقلاب آنے والا ہے۔ اگر پاکستان کو اپنے سیاق و سباق میں دیکھا جائے تو بنگلہ دیش ان ہی دنوں میں بنا تھا اور پاکستان میں قومیتوں کی تحریکیں چل رہی تھیں۔ مجھے بہر حال ان تحریکوں سے دلی لگاؤ تھا۔ میں نے محسوس کر لیا تھا کہ پاکستان کے مختلف صوبوں میں مختلف قومیتیں آباد ہیں۔ مجھے سندھیوں اور بلوچیوں سے زیادہ واسطہ تھا کیونکہ میں سندھ میں‌رہتی تھی اور جانتی تھی کہ ان کے ساتھ برابری کا سلوک نہیں کیا جاتا۔ وہ invisible ہوے پڑے ہیں۔ میں leftist scene میں involve تھی۔ ایک مدرسۂ خیال تھا کہ یہ باتیں غلط ہیں اور سب قومیتوں کو برابر کے حقوق ملنے چاہئیں۔ مجھے لوگ pro-China

کہا کرتے تھے۔

بعض لوگ کہتے تھے کہ صرف طبقاتی سوال اہم ہے۔ قومیتوں کا سوال اہم نہیں۔ لیکن میرا طبعی رجحان یہ کہتا تھا کہ طبقاتی سوال بھی اہم ہے اور قومیتوں کا سوال بھی اہم ہے۔ میں نے چند بلوچیوں اور سندھیوں کے سیاسی گروہ تلاش کر لیے تھے جو قومیتوں کے سوال کو support کرتے تھے۔اس زمانے میں میں نے بلوچستان میں فوج کشی کے خلاف نظمیں لکھی تھیں۔ اردو کے کسی شاعرنے اس قسم کی نظمیں نہیں لکھی تھیں۔ قومی حقوق کی جو جد و جہد تھی، میں اس کی حمایت کرتی تھی۔ میں خود اردو بولنے والی ہوں، لیکن میں نے سندھیوں کے حقوق کی حمایت میں نظمیں لکھی ہیں۔

میرے خاندان والے ہندوستان سے آئے تھے۔ جب میں نے وہ نظمیں لکھیں تو میں اردو بولنے والوں میں ایک اجنبی بن گئی تھی۔ وہ کہتے کہ یہ کیا ہے کہ فہمیدہ سندھیوں اور بلوچیوں کی حمایت کرتی رہتی ہے۔ مجھے ان کی طرف سے معاندانہ سلوک کا سامنا کرنا پڑا، لیکن مجھے اپنے موقف پر اعتماد تھا۔ اس دور میں بلوچیوں اور سندھیوں نے مجھے اور میں نے انہیں suppor کیا۔

خ۔ س۔: آپ نے اپنی کتاب ''دھوپ'' کے دیباچے میں لکھا ہے، ''ہماری بولی کو پچھلے بیس پچیس برسوں میں جس صفائی سے ہندی الفاظ سے پاک کیا گیا ہے ااور ایک مذہبی رنگ دیا گیا ہے اس نے اس بولی کو کیسے اپاہج بنا ڈالا ہے۔'' بولی کو مذہبی رنگ دیا ہی نہیں جا سکتا نہ زبان کسی مذہب کا شاخسانہ ہو سکتی ہے۔ کوئی بھی زبان مذہب سے پہلے وجود رکھتی ہے۔ مذہبی کتاب کسی زبان میں تو لکھی جاسکتی ہے لیکن زبان تو مذہب کی پیرو نہیں بن جاتی۔

ف۔ ر۔: زبان کے حوالے سے بھی یہ نظریات اس خاص ماحول کی پیداوار تھے جس میں کہ میں تھی۔ اردو پاکستان کے کسی بھی حصے کی زبان نہیں تھی۔ میں سمجھتی ہوں اس کو جو مذہبی رنگ دیا گیا ہے وہ ٹھیک نہیں ہے۔ میں اردو کو ہندی کے الفاظ سے پاک کرنے کی کوشش کے خلاف ہوں۔ ''دھوپ'' میں جان بوجھ کر میں نے ہندی الفاظ کو استعمال کرنے کی کوشش کی تھی۔

خ۔ س۔: مغرب میں فیمنسٹ رائٹرز کا ایک گروہ سمجھتا ہے کہ عورتوں کی آزادی اور خودمختاری کے لیے ضروری ہے کہ وہ مذہب سے دور رہیں۔ ان کا خیال ہے کہ مذہب

عورتوں کے مساوی حقوق کو قبول نہیں کرتا۔ کیتھولك چرچ میںعورت ''پوپ'' نہیں بن سکتی۔ اسلام میں بھی عورت نماز کی امامت نہیں کرسکتی۔ وہ مذہب کو patriarchal system کی پیداوار سمجھتی ہیں۔ آپ کا اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟

ف۔ ر۔: دیکھیے میں سمجھتی ہوں، خالد سہیل، کہ عورتیں مردوں کی نسبت زیادہ حقیقت پسند ہوتی ہیں۔ عورتوں کو زندگی کی بنیادی چیزوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہ زندگی کو زیادہ نزدیك سے دیکھتی ہیں۔

یہ سچ ہے کہ پدر سری نظام عرصے سے قائم ہے اور بہت سے مذاہب اس کی پیداوار ہیں۔ لیکن دنیا میں مادرسری نظام بھی تھے، خاص طور پر اگر ہندو مذہب کو دیکھیں تو اس میں آپ کو مادرسری نظام کی باقیات بھی مل جائیں گی۔ ہندو مذہب میں بہت سی طاقتور دیویاں بھی موجود ہیں۔ یہ سچ ہے کہ سامی مذہب کی تینوں کڑیاں، یہودیت، عیسائیت اور اسلام، پدرسری نظام کی پیداوار ہیں لیکن ہر مذہب کے بارے میں ایسا نہیں کہا جاسکتا۔

ہر چیز جو پدرسری نظام نے پیدا کی وہ خراب نہیں تھی۔ پدرسری نظام اور معاشرے میں بہت سی خوبصورت عمارتیں تعمیر ہوئیں، ادب تخلیق ہوا، موسیقی نے فروغ پایا۔ ہم ان سب چیزوں کو غلط تو نہیں کہہ سکتے۔

آخر مرد ہے کون بھلا؟ وہ میرا باپ ہے، وہ میرا بیٹا ہے، وہ میری ذات کا حصہ ہے۔ میں اس کی تخلیق کی ہوئی ہر چیز کو کیوں ٹھکراؤں؟ یہ بہت ہی عجیب سی بات ہوگی کہ میں ایك ایسی دنیا میں رہنا چاہوں جہاں صرف عورتیں ہی عورتیں ہوں۔ وہ تو ایك بہت ہولناك سی دنیا ہوگی۔ ہم اپنی ماؤں کی اولاد ہیںلیکن اپنے باپوں کی بھی تو اولاد ہیں۔ ہم اپنی بیٹیوں کی مائیں ہیں لیکن اپنے بیٹوں کی بھی مائیں ہیں۔ اس وجہ سے میں مذہب کو بالکل ہی رد اس لیے نہیںکروں گی کہ وہ ایك پدرسری نظام کی پیداوار ہے۔ میں خود بھی ایك مرد کی اولاد ہوں۔ اس کے چہرے کے نقوش میرے چہرے میں ہیں۔ اس کے ذہن کا ایك حصہ میرے ذہن میں موجود ہے۔ اس کی کتنی عادتیں مجھ میں آئی ہیں۔ ایسی چیزوں کو تعصب کے عالم میں بالکل رجیکٹ نہیں کیا جاسکتا۔

مذہب کی بعض چیزیں بے شك پدرسری نظام کے جبر کو ظاہر کرتی ہیں۔ ان چیزوں کو آہستہ آہستہ ختم کرنے کی جد و جہد کرنی چاہیے۔ خود مذہب میں بھی یہ جد و جہد

جاری ہے۔

ہم مغرب سے ذرا ہٹے ہوے دور میں زندہ ہیں۔ ایک سطح پر ہم ان کے ساتھ ہیں کیونکہ ایک ہی دور میں زندہ ہیں ، اور ایک سطح پر مختلف۔ ہم economics اور modes of production کی وجہ سے ان سے بچھڑے ہوے بھی ہیں۔

پدرسری نظام میں تبدیلیاں آرہی ہیں۔ ٹورانٹو کی ایک مسجد میں ایک لڑکی کھڑی ہوگئی اور کہنے لگی۔ ''آپ مجھے پیچھے کیوں بٹھا رہے ہیں؟'' آہستہ آہستہ ایک دن وہ لڑکی منبر تک پہنچ جائے گی۔

خ۔ س۔: آپ کے رویے میں مردوں کے لیے ہمدردی ہے، زندگی کے مسائل کو سلجھانے کی کوشش ہے، غصہ، نفرت اور تلخی نہیں ہے۔ کیا اس کی وجہ ایسے role models ہیں جنھوں نے آپ کو confrontation کے بجاے cooperation کی ترغیب دی، یا آپ خود اپنی کوشش سے اس رویے تک پہنچی ہیں؟

ف۔ ر۔: دیکھیے نہ خالد سہیل، ہمارے ہاں عورت ہونے اور وہ بھی مڈل کلاس کی عورت ہونے کے ناتے ہمارا دنیا سے رابطہ بہت محدود ہوتا ہے۔ میرے سامنے ایسے لوگ نہیں تھے جن سے میں بہت زیادہ ملی ہوں اور انھوں نے میری شخصیت کو متاثر کیا ہو۔ موقع ہی نہیں آتا ملنے کا۔ ہمارے معاشرے میں لڑکیاں لڑکوں سے ملتی ہی نہیں۔ ہمارے ہاں ہوسٹلوں میں جہاں لڑکیاں رہتی ہیں پرندہ پر نہیں مارسکتا۔ لیکن ملنا صرف جسمانی طور پر تو نہیں ہوتا۔ بہت سے پیارے لکھنے والے تو تھے جنھوں نے میری زندگی کو متاثر کیا، اور پھر اپنا ایک رجحان بھی تو ہوتا ہے۔ میں سمجھتی ہوں ــ گو یہ ایک گھسی پٹی بات لگے گی اور بہت سی عورتیں اسے پسند نہیں کریں گی کیونکہ عورت کو اتنا ماں ماں کہا گیا ہے کہ وہ اس سے تنگ آچکی ہے۔ تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ اگر آپ نے اولاد پیدا کی ہے تو آپ کی جبلت اسے محفوظ بھی رکھنا چاہتی ہے، اسے پروان بھی چڑھانا چاہتی ہے۔ آپ چاہتے ہیں کہ آپ کی اولاد اچھی‌سی زندگی گزارے، اس لیے آپ کا رجحان چیزوں کو سلجھانے کی طرف ہوگا کیونکہ اگر آپ کی نگاہ میں دنیا تاریک ہے تو آپ نے بچہ کیوں پیدا کیا، یا پیدا ہوتے ہی اس کا گلا کیوں نہیں گھونٹ دیا۔ میں ایک ماں ہوں، میں بائیس سال کی تھی جب میری پہلی بچی پیدا ہوئی تھی۔ میں ماں ہونے کے ناطے سوچتی ہوں کہ confrontation کا کیا فائدہ ہے۔ ہار کیا ہے، جیت کیا ہے۔ مجھے مہاتما بدھ کا ایک قول بہت پسند

پے: .In conclusive victory both sides should win equally انھوں نے کتنی پیاری بات کی تھی۔ میں نے اپنی ایک نظم میں لکھا تھا:

پے اصل جیت کی بس یہ ریت
کہ دونوں جائیں برابر جیت

اگر ایک فرقے کی جیت ہوئی تو جنگ جاری رہے گی۔ جیت تو ہوگی، وکٹری تو ہوگی لیکن conclusive نہیں ہوگی۔

خ۔ س۔: حال ہی میں آپ کی فروغ فرخ زاد کی نظموں کے تراجم کی کتاب ''کھلی کھڑکی سے'' چھپی ہے۔ کیا آپ بتائیں گی کہ آپ کا اس ایرانی شاعرہ سے تعارف کیسے ہوا اور آپ ان کی نظموں کے تراجم کرنے سے کیسے inspire ہوئیں۔

ف۔ ر۔: میں نے فروغ فرخ زاد کی نظموں کے تراجم کرنے کے بعد ایک نظم اس کے لیے لکھی تھی جو اس کتاب کے آخر میں شامل ہے۔ اس میں میں نے اپنے جذبات کا اظہار کیا تھا۔ تعارف یوں ہوا کہ میرے ایک پیارے شاعر دوست ذیشان ساحل ہیں۔ وہ اکثر میرے لیے چھوٹے چھوٹے تحفے لاتے رہتے ہیں۔ وہ میرے لیے ایک فروغ فرخ زاد کی کتاب لے کر آئے۔ ایک کتاب میرے پاس پہلے سے ہی پڑی ہوئی تھی۔ میں نے ایک رات کتاب پڑھنی شروع کی اور پھر اس کتاب نے مجھے نہیں چھوڑا۔ میں نے فروغ فرخ زاد کو ان کتابوں کے حوالے سے دریافت کیا۔ ان کی چیزیں پڑھ کر میرا عجب حال ہوا۔ چیزیں خود ہی ترجمہ ہو ہو کر آرہی تھیں۔ پھر میں نے ان کی اور کتابیں جمع کیں۔ ان کا سارا کلام پڑھا۔ یقین کریں خالد سہیل کہ میں دن رات جاگتی رہتی۔ اس طاقتور شاعری نے مجھے بہت حیران کیا۔ مجھے حیرانی یہ ہوئی کہ مجھے ان کی نظموں اور اپنی کتاب ''بدن دریدہ'' کی نظموں میں بہت مماثلت نظر آئی۔ میں نے سوچا یہ اچھا ہوا کہ میں نے یہ نظمیں پہلے نہیں پڑھیں ورنہ میں اپنی نظمیں نہ لکھتی اور سوچتی ایسی نظمیں تو لکھی جاچکی ہیں۔

خ۔ س۔: میں ترجمے کو تخلیقی کام سمجھتا ہوں لیکن بعض ادیب ایسا نہیں سمجھتے۔ آپ کا کیا خیال ہے۔

ف۔ ر۔: دیکھیے، جہاں آپ کا مزاج اس ادیب سے مل جائے جس کی تحریروں کے آپ تراجم کر رہے ہیں تو پھر تو ایک اچھا خاصا معجزہ پیدا ہوتاہے۔ میں نے شیخ ایاز کے سندھی

کلام کی تقریباً چار سو نظمیں ترجمہ کی ہیں اور وہ بھی میرے لیے ایک نہایت ہی مسرت انگیز تجربہ تھا کیونکہ ان کی شاعری پڑھتے ہوے میں جھومتی تھی اور پھر اپنی زبان میں وہی کہنا چاہتی تھی جو انھوں نے کہا ہے، یعنی میں دہرانا چاہتی تھی۔

ترجمہ کرتے ہوے آپ کسی اور کو داد دے رہے ہوتے ہیں، جھوم رہے ہوتے ہیں، اپنی زبان میں دہرا رہے ہوتے ہیں۔ ترجمے تو بہت تخلیقی چیز ہوتے ہیں۔ انسان ترجمہ کرتے ہوے اتنا ازخودرفتہ ہوتا ہے وہ اپنے آپ سے اوپر اٹھ جاتا ہے، وہ اپنے دائرے میں نہیں رہتا، وہ کسی اور انسان سے ذہنی رابطہ قائم کر رہا ہوتا ہے۔

خ۔ س۔: میں آپ کے بچپن کے ماحول کی طرف جانا چاہتا ہوں۔ آپ کی مادری زبان کی طرف اور اس ادب کی طرف جس سے سب سے پہلے آپ کا تعارف ہوا۔

ف۔ ر۔: میرے والدین تقسیم سے بہت پہلے ہندوستان سے آکر سندہ میں آباد ہو گئے تھے۔ تیس کی دہائی میں جو مسلمان afford کر سکتے تھے، وہ علی گڑھ جایا کرتے تھے۔ ان دنوں ہندوستان میں بے روزگاری تھی اس لیے میرے والد، جو علی گڑھ کے گریجویٹ تھے، مسلمانوں کے ایک ہائی اسکول میں پڑھانے حیدرآباد چلے آئے۔ میں ویسے ۱۹۴۵ میں میرٹھ میں اس لیے پیدا ہوئی کہ میری والدہ زچگی کے لیے اپنے میکے چلی گئی تھیں۔

بچپن کا ماحول کیا تھا؟ ماحول یہ تھا خالد سہیل کہ میں پانچ سال کی تھی کہ میرے والد کا انتقال ہو گیا۔ والد چونکہ استاد تھے اس لیے انھوں نے جو ورثہ چھوڑا وہ کتابیں تھیں۔ انھیں کتابوں کو پڑھ پڑھ کر میں سوچا کرتی تھی کہ میرے والد کیسے ہوں گے۔ میری والدہ یو۔ پی۔ کی تھیں۔ ان کے والد ایک زمانے میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ وہ کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ انھوں نے اپنی بیٹیوں کو بھی تعلیم دلوائی تھی۔ گھر میں پنڈت آ کر فارسی عربی اردو اور تھوڑی بہت انگریزی پڑھاتے تھے۔ میری والدہ کا اپنا رجحان ایسا تھا کہ انھیں بے انتہا شعر یاد تھے۔ میری پرورش گویا میری والدہ کے اشعار سے ہی ہوئی تھی۔ وہ ہمیں صبح اٹھاتی بھی تھیں تو اسمعیل میرٹھی کے ''اٹھو بیٹی آنکھیں کھولو / بستر چھوڑو اور منہ دھولو'' جیسے اشعار پڑھ کر اٹھاتی تھیں۔ انھیں بے شمار مثنویاں بھی یاد تھیں۔ جب بعد میں میں نے انھیں ڈھونڈنا چاہا تو وہ نہیں ملیں کیونکہ وہ معروف مثنویاں نہیں تھیں، غالباً یو۔ پی۔ میں ان دنوں شعر و شاعری کا بہت چرچا تھا۔

میری والدہ میں شعر شناسی کا بہت سلیقہ تھا۔ انھوں نے ''گلستان'' اور ''بوستان''

اپنے پنڈت سے پڑھی تھیں۔ ان دنوں خواتین پردے کے ایک طرف بیٹھتی تھیں اور ہندو پنڈت دوسری طرف۔ میری والدہ بہت ہنس کے سناتی تھیں کہ اگر کچھ دیر خاموشی رہتی تو پنڈت پردے کے پیچھے گردن ڈال کر دیکھتے تھے کہ ہم کام کر رہے ہیں یا نہیں۔

مجھے بھی بچپن سے بآوازِ بلند اشعار پڑھنے کا شوق تھا۔ اگر وزن کی کوئی غلطی کرتی تو والدہ ٹوک دیتی تھیں۔ چنانچہ انھوں نے مجھے وزن سے شعر پڑھنا سکھایا۔ بعد میں جب میں نے خود شاعری کرنی شروع کی تو وہ بہت پچھتائیں۔

چونکہ ہم یتیم تھے اس لیے غربت کو اور زندگی کی دیگر بے رحم سچائیوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔

میں نویں دسویں جماعت میں تھی جب میں نے لکھنا شروع کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب فیض صاحب میرے شہر حیدرآباد کی جیل میں تھے۔ ایک تحریک تھی جس کی اڑتی اڑتی خبریں ہم تک پہنچتی رہتی تھیں۔ ہمارا نوجوانی کا دور پاکستان میں طلبہ کی تحریک کا زمانہ تھا۔ جب میں کالج میں تھی تو اس وقت ایوب خان کے خلاف ایک تحریک شروع ہو چکی تھی۔ ۱۹۶۵ کی جنگ کے بعد کراچی سے، مجھے اب بھی یاد ہے، کچھ NSF کے نوجوانوں کو، جن میں معراج محمد خان بھی شامل تھے، شہر بدر کیا گیا تھا۔ ان دنوں ایوب خان نے یونیورسٹی آرڈیننس جاری کیا تھا جس کے تحت طلبہ کو سیاست میں حصہ لینے کی اجازت نہیں تھی۔ Establishment کی یہ بڑی احمقانہ بات تھی۔ بارہ تیرہ لڑکوں کو ایک شہر سے دوسرے شہر بھیجنے سے آگ لگ رہی تھی، پھیل رہی تھی۔ ہم نے اس زمانے میں بڑے زور شور سے اس تحریک میں حصہ لینا شروع کیا تھا۔

اس دور میں ہم فیض صاحب کی کتابیں اور سوشلسٹ لٹریچر چُھپ چُھپ کر پڑھتے تھے۔ پاکستان میں کمیونسٹ پارٹی ۱۹۵٤ سے ban تھی۔ سب چیزیں زیرِ زمین ہوتی تھیں۔ ہمیں ایک کتاب *Notes from the Gallows* مل گئی تھی۔ وہ ایک چیکوسلویکی ادیب کی تھی جسے ناتسیوں نے کمیونسٹ ہونے کی وجہ سے مار ڈالا تھا۔ وہ کتاب ہم نے بڑی مشکل سے حاصل کی تھی اور لحاف میں ٹارچ کی روشنی میں پڑھی تھی۔ بھٹو صاحب کے آنے کے بعد اور چین سے دوستی کے بعد کمیونسٹ لٹریچر عام ملنے لگا تھا۔ اس سے پہلے وہ کتابیں بہت معیوب سمجھی جاتی تھیں۔

خ۔ س۔: اسکول میں آپ کا ذریعۂ تعلیم اردو تھا یا سندھی؟

ف۔ ر۔: دیکھیے جسے ذریعۂ تعلیم کہتے ہیں وہ تو اردو ہی تھا۔ چونکہ ہم حیدرآباد میں رہتے تھے اس لیے ہمیں آٹھویں جماعت تک سندھی بھی پڑھائی جاتی تھی۔ ہمارے ایک پیارے سے ہندو استاد تھے۔ وہ صبح صبح چیونٹیوں کو دانہ ڈالتے تھے۔ وہ ہمیں سندھی پڑھایا کرتے تھے۔ پھر اچانک سے غیر سندھیوں کو سندھی پڑھانی ختم کردی گئی، اس سے ہمارے استاد کی نوکری ختم ہو گئی۔

خ۔ س۔: جب آپ نے شاعری شروع کی تو گھر والوں کا اور اسکول کالج میں لوگوں کا ردِ عمل کیا تھا؟

ف۔ ر۔: میری والدہ اس زمانے میں میرے شعر کہنے کو اتنا سنجیدگی سے تو نہیں لیتی تھیں، اس لیے انھیں کوئی اعتراض بھی نہیں تھا۔ وہ چاہتی تھیں کہ میں ڈاکٹر بنوں۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ میں سائنس پڑھوں۔

گھر سے باہر کی دنیا میں بھی ساٹھ کی دہائی میں ردِ عمل منفی نہیں تھا۔ کسی لڑکی کا شعر کہنا اچھا اور دلچسپ سمجھا جاتا تھا۔

خ۔ س۔: آپ *Notes from the Gallows* کی بات کر رہی تھیں۔ آپ کا انگریزی ادب سے لگاؤ کب اور کیسے پیدا ہوا؟

ف۔ ر۔: اس دور میں ترقی پسند خیالات صرف انگریزی میں ہی نہیں تھے۔ ہم فیض صاحب کا ''زندان نامہ'' اور منٹو اور کرشن چندر کی کہانیاں بھی پڑھ رہے تھے۔ ترقی پسند ادب کا پورے کا پورا ورثہ ہم تک پہنچا تھا جس سے سیکولر خیالات ہم تک آرہے تھے۔ میں ہندوستانی دوستوں سے کہتی ہوں کہ سولہ سال کی عمر سے جب بھی کسی ہندو کے بارے میں سوچتی ہوں تو میری نگاہ میں کرشن چندر کا پیارا چہرہ آجاتا ہے۔ سِکھ میرے لیے راجندر سنگھ بیدی تھے۔ میں ان لوگوں کو دشمن کے روپ میں کیسے دیکھ سکتی ہوں۔ ان لوگوں نے ہمارے دلوں کو جیت لیا تھا زندگی بھر کے لیے۔ کتنا اچھا سرمایہ تھا اردو کا۔ مختلف مذاہب کے لوگوں نے اس میں لکھا تھا۔ بہترین اوراعلیٰ ترین انسانی قدروں کا اس میں اظہار کیا تھا۔

بہت سا ادب جو میں نے اس دور میں پڑھا وہ تقسیمِ ہند کے وقت جو خوں ریزی ہوئی تھی اس کے بارے میں تھا جس نے میری نگاہوں کے سامنے واضح کر دیا تھا کہ برادر کشی کتنی لاحاصل، کتنی غلط چیز ہے۔ وہ بہت اچھی کہانیاں تھیں، اچھی شاعری تھی۔

اس کی مثال آج بھی مشکل سے ملتی ہے۔ آپ منٹو کی ''موزیل'' کو کیسے بھولیں گے جو سِکھ کو بچا رہی ہے۔ آپ ''ٹھنڈا گوشت'' کیسے بھول سکتے ہیں۔ افسوس تو یہ ہے کہ اس سے بہتر کوئی چیز سامنے نہیں آئی۔

خ۔ س۔: آپ نے کن حالات میں پاکستان چھوڑا اور پھر آپ کن حالات میں واپس آئیں، اس کے بارے میں کچھ بتائیں۔

ف۔ ر۔: میں ملک سے دو دفعہ سات سات برس کے لیے باہر گئی تھی۔ جب میں اکیس برس کی تھی تو میری شادی کر دی گئی تھی اور میں انگلینڈ چلی آئی تھی۔ ''بدن دریدہ'' کی بہت سی نظمیں اسی زمانے کی لکھی گئی ہیں۔ اس کے بعد میری شادی ختم ہوگئی تھی اور میں اپنی بچی کے ساتھ واپس آگئی تھی۔ پھر میں نے ایک سندھی شخص سے دوسری شادی کی۔ اس وقت تک میں سیاسی سوچ رکھنے لگی تھی۔ اس دور میں ہاریوں کی کسانوں کی ایک جماعت تھی۔ وہ اس کے ساتھ کام کرتے تھے۔ بھٹو صاحب کی قید کے بعد تو پورا سیاسی نقشہ بدل گیا تھا۔ ہم بھٹو صاحب کی آمریت کی مخالفت کرتے تھے ۔ جو کچھ ہو رہا تھا غلط ہو رہا تھا۔ لیکن اس کے بعد اندھا مارشل لا آگیا تھا۔ اس زمانے میں میں نے ایک رسالہ نکالنا شروع کیا تھا جس کا نام ''آواز'' تھا۔ اس رسالے پر ضیاُالحق کی حکومت نے چودہ مقدمے دائر کیے تھے۔ ان میں سے ایک تو British Penal Code کا ۱۲٤ تھا جو بغاوت کے لیے ہوتا ہے اور اس کی سزا پھانسی ہوتی ہے، اس کا مجھ پر چارج لگا رکھا تھا۔ تب تک میرے دو بچے اور ہو گئے تھے۔ اٹھارہ مہینے تک ہم وہ مقدمہ جھیلتے رہے۔ ہوتا یہ تھا کہ ہمیں عدالت میں بلا کر بٹھا لیتے تھے لیکن مقدمے کی سماعت نہیں ہوتی تھی۔ میری کتاب ''کیا تم پورا چاند نہ دیکھو گے'' میں اس تجربے کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ اس دور میں میرے شوہر نے بے نظیر بھٹو کے ساتھ کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ یہ ۱۹۷۵ کی بات ہے۔ وہ پیپلز پارٹی میں شامل ہوگئے تھے اور میں دل سے ان کے ساتھ تھی۔ لیکن جب ان کو بھی گرفتار کر لیا گیا تو عجب افراتفری کا دور شروع ہوا۔ اس وقت لوگ ملک چھوڑ کر باہر جا رہے تھے اور ہم بھی نکل گئے۔

اس زمانے میں ہندوستان سے مجھے ایک شاعر دوست کا دعوت نامہ ملا۔ اس سے ایک سال پہلے میں ہندوستان کا چکر لگا کر آئی تھی۔ امرتا پریتم کے پاس ٹھہری تھی۔ وہ ہماری بہت پیاری دوست ہیں۔ اس دفعہ میں اپنے دونوں بچوں کو بھی ساتھ لے گئی۔

پاکستان میں دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ میری ضمانت دینے والا کوئی نہیں بچا تھا۔ ہمارے سب جرنلسٹ دوست جیل میں تھے۔ جب میں ہندوستان آگئی تو میں نے سوچا کہ اب واپس نہیں جاؤں گی۔ سوچا یہاں کچھ وقت گزار لیتے ہیں۔ لیکن وہ وقت کھنچتا چلا گیا۔ ضیاء الحق صاحب بہت طویل عرصے تک رہے۔ ہمیں توقع ہی نہیں تھی کی اتنا عرصہ رہیں گے۔ ہم ہر سال سوچتے تھے کہ اس سال کچھ نہ کچھ ہو ہی جائے گا لیکن نہیں ہو پاتا تھا۔ پوری مغربی دنیا ان کی حمایت کر رہی تھی۔ خاص کر افغان افئیر کے چکر میں۔

بچے بڑے ہونے لگے۔ ہم بہت دن پریشان رہے۔ بہت تکلیف دہ تھی وہ ساری کیفیت لیکن ان حالات نے مجھے ہندوستان میں رہنے کا موقع دیا۔ اس معاشرے کو قریب سے دیکھنے کا موقع دیا۔ بہت سی چیزیں سمجھیں۔ پاکستان میں تو ہندو تعصب کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ وہاں جا کر دیکھا کہ یہ چیزیں کتنی تکلیف دہ بن سکتی ہیں، یعنی پاکستان کیوں بنا؟ یہ سمجھ میں آیا وہاں جا کر رہنے سے۔ یہ میں نہیں کہتی کہ جو کچھ ہوا صحیح ہوا۔ شاید بہتر یہی ہو کہ لوگ مل کر ساتھ رہ سکیں۔

اب جب میں سنتی ہوں کہ اردو بولنے والوں کا، مہاجروں کا علیحدہ صوبہ ہونا چاہیے تو سوچتی ہوں کہ ان سے کہوں کہ آخر کب تک تم چھوٹے سے چھوٹے گروہ میں بٹتے جاؤ گے۔ ساتھ مل کر بھی تو رہا جا سکتا ہے۔ چنانچہ وہ میری زندگی کا ایک اہم دور تھا۔ اس کا کیا کیا جائے کہ پاکستان میں بعض لوگوں کے لیے ہندوستان میں رہنا بہت بڑا گناہ ہے۔

خ۔ س۔: آپ نے ''آج'' رسالے کے لیے جو کام کیا ہے اس میں کراچی کے مسائل کے حوالے سے آپ کی بہت سی تخلیقات شامل ہیں۔ آپ کی کراچی کے سیاسی حالات کے بارے میں کیا رائے ہے؟

ف۔ ر۔: خالد! میں بنیادی طور پر جمہوریت پسند انسان ہوں۔ کمیونزم کی ڈکٹیٹرشپ بالکل میرے مزاج کے موافق نہیں تھی۔ روس کی بہت بڑی امپائر کے ختم ہونے کا مجھے دکھ نہیں ہے، یعنی سوویت یونین ختم ہو گیا اور اس کے مختلف حصے آزاد ہو گئے۔ اگر وہ زبردستی ساتھ رکھے گئے تھے تو اچھا ہوا کہ وہ آزاد ہو گئے۔ زبردستی ساتھ رکھنا تو غلط چیز تھی۔ میں پیپلز پارٹی کے دور میں ایک ادبی وفد کے ساتھ قازقستان گئی تھی۔ میں

نے اس سفر کے حوالے سے ایک کہانی بھی لکھی تھی۔ اہم بات یہ ہے کہ کمیونسٹ نظام کو ان لوگوں نے رد کیا ہے جہاں کہ وہ رائج تھا۔ میرے بعض دوست کہتے ہیں کہ وہ ایک بہت بڑی سازش تھی۔ میں کبھی اس بات پر یقین نہیں کرتی کہ کوئی اہم تبدیلی محض سازش ہوتی ہے۔ اگر حالات ایک خاص حد تک سازگار نہ ہوں تو کوئی سازش کامیاب ہو ہی نہیں سکتی۔ وہ چیزوں کو ذرا آگے بڑھا سکتی ہے، جلدی کرا سکتی ہے، لیکن کوئی چیز صرف سازش کی وجہ سے نہیں ہوتی۔

اگرچہ میں غیر طبقاتی سماج کی قائل تھی لیکن اس انقلاب کے بعد مجھے اپنے خیالات پر نظرِ ثانی کرنی پڑی۔ جس چیز کو ہم دور سے بے انتہا پیارا سمجھتے رہے تھے ہمیں اس کی خامیوں کا پتہ نہیں تھا۔ مجھے اپنے سوشلسٹ نظام کی سیاسی جد و جہد کو ریویو کرنے کا موقع ملا۔ اسی زمانے میں بر سرِاقتدار حکومتوں نے پاکستان میں سیاسی جماعتوں کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے سامنے کوئی آدرش، کوئی آئڈیل نہیں رہا۔ اس طرح قومیتوں کے حقوق کی جتنی تحریکیں تھیں انھوں نے فسطائی صورتِ حال اختیار کر لی۔ حقوق کی بات پیچھے رہ گئی۔ ایک دوسرے سے intolerance حد سے بڑھ گیا۔ یہ کوشش شروع ہوگئی کہ کونسا گروپ سب سے زیادہ پیسہ بنا سکتا ہے، کما نہیں سکتا، کھینچ سکتا ہے۔ اس چیز نے بڑی تکلیف دہ صورت اختیار کر لی۔ دائرے تنگ سے تنگ تر ہوتے چلے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اب آپ اپنے آپ کو کسی ایک سائیڈ پر پوری طرح نہیں پاتے۔ سب آپ سے مطالبہ کرتے ہیں کہ آپ پوری طرح ان کے ساتھ مل جائیں۔ ایسی صورتِ حال میں ایسا ادیب جو اپنے ضمیر کے ساتھ سچا رہنا چاہتا ہے کیا کرے گا۔ آپ ایم۔ کیو۔ ایم۔ اور پیپلز پارٹی کی مثال لیں۔ سندھ میں یہ دو جماعتیں ہیں۔ ایک سندھیوں کی حمایت کرتی ہے، دوسری اردو بولنے والوں کی۔ آپ دونوں کی باتیں سنیں۔ جب ہم سندھی حقوق کی حمایت کر رہے تھے تو کیا ہم نے سوچا تھا کہ وہ تمام مہاجروں کو نکال دینا چاہیں گے، انھیں کیمپوں میں پہنچانا چاہیں گے۔ اسی طرح مہاجروں پر برا وقت گزرا ہے۔ ان کے ہزاروں لڑکے گھر سے غائب ہو گئے ہیں۔ قید میں ہیں۔ ان کے گروپ بنوا دیے گئے۔ قتل کرا دیے گئے۔ وہ بھی نہیں سمجھتے کہ اور لوگ بھی مصیبت میں رہے ہیں۔ وہ صرف اپنی ہی بات کرنا چاہتے ہیں۔ وہ نہیں دیکھنا چاہتے کہ یہ سب ایک ہی جد و جہد کا، ظلم کے تسلسل کا حصہ ہے۔ مجھے وہ وقت یاد ہے جب پورے ملک میں جمہوری جد و جہد ہو رہی

تھی۔ میں بھی اس کا ایک حصہ تھی۔ اس وقت سوائے پیپلز پارٹی کے پورے ملک میں کوئی بھی انتخابات کا نام لینے کو تیار نہ تھا۔ Afgan War کے بعد لوگ چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹ گئے ہیں۔ اب آپ بنیادی طور پر کسی ایک جماعت کا ساتھ نہیں دے سکتے۔

اب ہمارے ہاں چند غیرسرکاری تنظیمیں بھی بنی ہیں جوNGOs کہلاتی ہیں۔ خالد! ہوا یہ ہے کہ ان NGOs میں بہت سا لکھت پڑھت کا کام انگریزی میں ہوتا ہے۔ اس چکر میں وہ طبقہ جو انگریزی زبان نہیں جانتا تھا ان میں شامل نہیں ہوسکا۔ بنیادی طور پر یہ ایک بالائی طبقے کا سلسلہ ہے۔ انسانی حقوق کی تنظیم ہی کو لیجیے اس میں اگر اوپر کی طرف دیکھیں تو آپ کو [Colony] Defence اور Clifton [کراچی کے دو بے حد متمول رہائشی علاقے] میں رہنے والیوں کے سوا کوئی نظر ہی نہیں آتا۔ انھیں دیکھ کر مجھے اپنی نوجوانی یاد آتی ہے۔ اب اس میں متوسط طبقے کی عورتیں نہیں ہیں۔ میں اپنے طبقے سے وفادار ہوں۔ میں نے کوشش کی تھی کہ میں اپنے آپ کو ڈی کلاس کردوں۔ ورکنگ کلاس میں شامل ہو جاؤں، لیکن نہیں کر سکی۔ وہ میرا failure تھا۔ اپنے طبقے، اپنی کلاس کے حوالے میرے کپڑے اور جوتے ہی نہیں تھے، ذہن بھی تھا، کتابیں بھی تھیں، سوچ بھی تھی۔ انھیں بدلنا بہت مشکل تھا۔ میں ایک زمانے میں سمجھتی تھی کہ درمیانہ طبقہ بہت مکار ہوتا ہے، بہت موقع پرست ہوتا ہے، لیکن اب میں ایسا نہیں سمجھتی۔ اب میرا خیال ہے کہ ہر طبقے کا اپنا رول ہوتا ہے۔ نئے خیالات سب سے پہلے درمیانہ طبقہ اپناتا ہے۔

ہمارے ہاں نئے خیالات اور اعلیٰ اقدار کے علمبردار اعلیٰ درجے کے وہ لوگ ہیں جن کا طرزِ زندگی نفرت انگیز ہے۔ میں ان کے ساتھ اپنے آپ کو جوڑنے کا تصور بھی نہیں کرسکتی۔

خ۔ س۔: آپ ''وعدہ'' ادارے کے ساتھ کیسے منسلک ہوئیں؟

ف۔ ر۔: میں ایک عورت ہوں اور لکھنے والی ہوں۔ مجھے پتہ تھا کہ عورتوں کو کتنے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ میں عورتوں کا ایک اشاعتی ادارہ قائم کرنا چاہتی تھی۔ اس کا پہلا ڈرافٹ ہم نے بے نظیر بھٹو کے دور میں بنایا تھا۔ وہ چلی گئیں تو ادارے کا رجسٹر ہونا بھی ممکن نہیں رہا۔ پاکستان میں تو انسان کو مجرم بنا دیا جاتا ہے، اور بنایا بھی گیا۔ میرا نام لے کر نواز شریف اور ان کے ساتھیوں نے اسمبلی میں بات چیت کی۔ بے نظیر پر جو الزامات لگائے گئے ان میں ایک یہ تھا کہ اس نے فہمیدہ ریاض کو نوکری دی۔ اخباروں میں

اداریے لکھے گئے کہ فہمیدہ ریاض ایک terrorist ہے۔ کئی مہینے بہت سخت حالات رہے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ گزارا کیسے ہوگا۔

پھر ہم نے ''وعدہ'' رجسٹر کرایا۔ اصل کام اس وقت شروع ہوا جب میری نوکری دوبارہ ختم ہوئی۔ ہم نے عورتوں کے قانونی حقوق کے بارے میں کتاب چھاپی تاکہ عورتوں کو اندازہ ہو سکے کہ ان کے حقوق کیا ہیں۔ لوگوں کو وہ کتاب بہت پسند آئی۔ لیکن پھر شریعت بِل سامنے آگیا۔ شریعت بل کی موجودگی میں آئین بے کار ہو گیا۔ بات ہی ختم ہو گئی۔ کیے کرایے پر پانی پھر گیا۔

خ۔ س۔: آپ ان پاکستانی ادیبوں میں‌سے ہیں جنھیں سوویت یونین، یورپ اور شمالی امریکا میں گھومنے اور رہنے کا موقع ملا۔ آپ کا اس تجربے کے بارے میں مجموعی تاثر کیا ہے؟

ف۔ ر۔: میں یورپ میں تھی تو میں نے ایک مارکسسٹ ماہرِ نفسیات ایرک فرام (Eric Fromm) کی کتاب *Escape from Freedom* کے بنیادی اصولوں کو سامنے رکھ کر اور پاکستانی سماج سے مثالیں دے کر ایک کتاب لکھی تھی، اس کا نام ''ادھورا آدمی'' تھا۔

مجموعی تاثر کیا ہے؟ خالد سہیل! جب میں کینیڈا آئی اور یہاں کے پاکستانیوں سے تبادلۂ خیال ہوا تو میں‌نے ان کی رائے سے اختلاف کیا۔ وہ کہنے لگے ''سفید فام لوگوں نے افریقا کی سیاہ فام قوموں اور ایشیا کی بھوری قوموں سے ظلم کیا ہے۔ انھیں ان کے ماضی کی سزا ملنی چاہیے۔'' میں نے کہا کہ آپ جنھیں سفید فام کہتے ہیں انھوں نے ایک دوسرے کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ آپ ذرا غور کریں یہودی تو کالے نہیں تھے۔

میں اب انسان کو انسان کے طور پر دیکھنے لگی ہوں۔ میں ان کو نہ سفید فام سمجھتی ہوں، نہ سیاہ فام۔ نہ صرف ہندو اور نہ صرف مسلمان سمجھ سکتی ہوں۔

میں مسلمان بھی ہوں، عورت بھی ہوں، براؤن بھی ہوں اور میری اپنی زبان بھی ہے۔

ہم سب کچھ ایک جملے میں نہیں نبٹا سکتے۔ وہ سفید فام ہیں لیکن ان کی زبان کیا ہے، مذہب کیا ہے، کلچرل بیک گراؤنڈ کیا ہے ــــ یہ سب اہم چیزیں ہیں۔ لوگوں کی صرف ایک آئڈینٹٹی نہیں ہوتی۔ وہ کہتے ہیں سفید فام لوگوں نے ایشینس پر ظلم کیا۔ میں کہتی ہوں ایشینس میں ہندو بھی آگئے، مسلمان بھی آگئے، بنگالی بھی آگئے۔ ایشینس خود ایک دوسرے پر کتنا ظلم کرتے ہیں۔

مجھے ایک عورت ملی۔ سعودی عرب کی تھی۔ کہنے لگی میں حجازی ہوں۔ دوسری قوموں سے مختلف ہوں۔ میں اب ذاتی تجربوں سے اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ انسانوں کی وحدت میں کثرت اور کثرت میں وحدت ہے۔

خ۔ س۔: اب میں آپ سے ایک آخری سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔ مجھے بعض دفعہ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے تیس، چالیس اور پچاس کی دہائیوں میں سیاسی اور ادبی دنیا میں قدآور شخصیتیں نظر آتی تھیں۔ سیاست میں گاندھی جی، چرچل، اور ڈیگال جیسے لوگ تھے اور ادب میں سارتر اور فیض جیسی شخصیتیں۔ ستّر اور اسّی کی دہائیوں کی شخصیتیں mediocre نظر آتی ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

ف۔ ر۔: دیکھیں خالد! یہ بھی تو ہو سکتا ہے کی بہت سی شخصیتوں کو ہم قریب سے دیکھ رہے ہوں، اس لیے ہم ان کی عظمت سے پوری طرح واقف نہ ہوں۔ جب ہمارے بچے انھیں دیکھیں گے تو شاید انھیں وہ شخصیتیں قدآور نظر آئیں۔

میرا خیال ہے ہمارا دور شکست و ریخت کا ہے۔ اس میں سے ایک نیا دور ابھرے گا۔ نئے آدرش سامنے آئیں گے۔ اس دور میں ایک اور دور بھی زندہ ہے۔ آپ بچوں سے باتیں کریں تو آپ کو ایک نئے دور کا، ایک نئی صبح کا اندازہ ہوگا۔ پھر آپ مایوس نہیں ہوں گے۔

اگرچہ ہمارے دور میں بے راہ روی بھی ہے، بے سمتی بھی، لیکن اس میں ایک نئی سمت کی تلاش بھی ہے۔

میری بیٹی سگریٹ پینے سے نفرت کرتی ہے۔ کہتی ہے آپ دنیا کو تباہ کر رہی ہیں۔ بچوں میں ماحولیاتی شعور پیدا ہو رہا ہے جو ہمارے زمانے میں تھا ہی نہیں۔ ہم سوچتے تھے جو چاہو پانی میں بہا دو۔ ہم ایک عبوری دور سے گزر رہے ہیں۔

میں اب زندگی کے اس دور میں ہوں جب آپ اپنا سرمایہ بچوں کے سپرد کر رہے ہوتے ہیں۔ ہم نے جو ورثے میں پایا تھا وہ بہتر تھا، ہم جو ورثے میں چھوڑے جا رہے ہیں وہ اتنا اچھا نہیں ہے۔ اب ہمارے بچے اس ورثے کا کیا کرتے ہیں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

خ۔س۔: شکریہ!

ف۔ ر۔: آپ کا بھی شکریہ۔